راجہ انور کی زندانی نثر

اجمل دانش*
Ajmal Danish
پروفیسر ڈاکٹر محمد آصف اعوان**
Prof. Dr. Muhammad Asif Awan

Abstract:
Pakistan has a limited number of ideological political workers but these are the very political workers who are the true champions of the ideological political fronts. Raja Anwar is a one of those stalwarts who have struggled and suffered for the survival and restoration of democracy in Pakistan which has frequently been derailed by military dictators. Raja Anwar suffered particularly for his leftist views and anti-zia struggles. His books provide a window to his readers to peep into his political times. However his daring style and bold stance distinctively distinguishes him from the rest of the political writers. His prison writings are apt 'exact' critical' and literary in their own way. He lives in USA these days and still have a passion for writing.

تحصیل کلر سیداں میں پیدا ہنے والے راجہ انور[۱] معروف صحافی، ادیب اور سیاسی کارکن کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ زمانہ طالب علمی سے ہی کارزارِ سیاست میں قدم رکھا۔ کمیونسٹ نظریات سے متاثر تھے۔ اس لیے انصاف، مساوات اور جمہوریت کی بقا کے لیے آواز بلند کی اور داخلِ زنداں کیے گئے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ حکومت میں حکومت کی جانب سے انہیں طلباء اور محنت کش طبقے کے لیے مشیر مقرر کیا گیا۔ جنرل ضیاء کے مارشل لاء کے بعد یہ کابل (افغانستان) فرار ہو گئے۔ کابل میں ہی انہوں نے بھٹو کے صاحبزادے میر مرتضیٰ بھٹو کی بنائی گئی تنظیم ''الذوالفقار'' میں شمولیت اختیار کی۔ ''الذوالفقار'' کی وجہ شہرت، ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی اور ان کی حکومت ختم کرنے کے خلاف تشدد آمیز کارروائیوں کے حوالہ سے ہے۔ ۱۹۸۰ء تک راجہ انور کابل میں مقیم رہے لیکن مرتضیٰ بھٹو سے ان کے اختلافات کی وجہ سے انہیں ''پلِ چرخی'' جیل کاٹنا پڑی۔ ۱۹۸۵ء میں انہیں اس قید سے اس وقت رہائی ملی جب مرتضیٰ بھٹو نے اپنی سرگرمیاں شام منتقل کیں۔ راجہ

☆ پی ایچ۔ڈی سکالر، شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد
☆☆ صدر شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

انور نے بڑی بھرپور زندگی گزاری۔ آج کل اپنے خاندان کے ساتھ برطانیہ میں مقیم ہیں۔ روزنامہ "دنیا" میں کالم لکھتے ہیں:

تصانیف

جھوٹے روپ کے درشن

ہمالہ کے اس پار

مارکسی اخلاقیات

دہشت گرد شہزادہ

قبر کی آغوش میں

بڑی جیل سے چھوٹی جیل تک

بڑی جیل سے چھوٹی جیل تک

ستمبر ۱۹۷۰ء کی ایک تاریک رات میں [۲] نوجوان طالب علم رہنما راجہ انور کو مارشل لاء ضابطوں کی خلاف ورزی پر گرفتار کر لیا گیا۔ رسمی کارروائی کے بعد انہیں راولپنڈی جیل منتقل کیا گیا اور پھر اس کے بعد بہاول پور جیل میں انہوں نے سزا پوری کی۔ راجہ انور کی کتاب "بڑی جیل سے چھوٹی جیل تک" کا بغور مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ کتاب کا مصنف "خوف" کے نام سے بھی آشنا نہیں ہے۔ جس طرح کا کھلنڈرا پن اس کی شخصیت کا حصہ ہے اسی طرح کی بے باکی اس کی تحریر میں بھی نظر آتی ہے۔ "گرم دم جستجو" سے سرشار راجہ انور جیل میں بھی "چارمنگ بوائے" ہے۔ ہمہ وقت سرگرم ہے اور اپنے رفقاء مختار رانا، معراج محمد خان، مولانا کوثر نیازی، میر احمد تالپور اور طارق عزیز کے درمیان اپنی جگہ خوب طریقے سے بناتے ہیں۔ پیدائشی ادیب ہیں اور بڑی بے باکی سے سچ کا اظہار کرتے ہیں۔ قدرت اللہ خان نمبر دار جیل کی زبانی سنا ہوا واقعہ انہوں نے جس روانی سے بیان کیا۔ بڑوں بڑوں کی حقیقت کھول کر رکھ دیتا ہے۔ اقتباس ذرا طویل ہے لیکن قابل مطالعہ ہے:

> "اس ضمن میں ایک اور قیدی کے دلچسپ شواہد بھی سنتے چلیے۔ یہ صاحب فرنٹیئر کے قدرت اللہ خان ہیں اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔۔۔ انہوں نے اپنی قید کا بیشتر حصہ ہری پور جیل میں کاٹا۔۔۔ ایک دن کہنے لگے "جب تک ایوب خان "بادشاہ" رہے، ہری پور جیل سے تقریباً تین سو قیدی، ہر سال ان کی

فصلوں کی کٹائی کے لیے جاتے تھے۔اس عرصہ میں دو دفعہ میں بھی قیدی نمبر دار کی حیثیت سے وہاں گیا۔ ہمیں روٹی جیل سے ملتی تھی اور دن کے وقت چائے وہاں سے۔ حقیقتاً بڑی تکلیف دہ مشقت تھی۔ایک دفعہ ایک بیس سال سزا یافتہ قیدی نے اچانک دوڑ کر خان کا بازو پکڑ لیا جس سے وہاں کھلبلی مچ گئی۔قیدی نے کہا ہمیں معاف کر دو کہ ہمارے معصوم بچے بھوک سے بلکتے ہوں گے یا پھر ہمیں گولی مروا دو۔خان گم سم کھڑے رہے۔ بعد ازاں جیل کے عملہ نے اس قیدی کو ”قیدِ تنہائی“ میں ڈال دیا۔“(۳)

دنیا بھر میں اور بالخصوص ترقی یافتہ ممالک میں جیل خانوں کو اصلاح کے مراکز کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ جیلوں میں ایسا ماحول فراہم کیا جاتا ہے جس سے قیدیوں کی ذہنی، جسمانی اور اخلاقی تربیت کا اہتمام کیا جا سکے لیکن بد قسمتی سے ہندوستان اور پاکستان میں جیلیں ”جرائم کی نرسریاں“ ہیں۔ راجہ انور کا مشاہدہ تیز اور محسوسات تیز تر ہیں۔ جیل میں گزرے ہوئے روز و شب کو سامنے رکھ کر وہ پاکستان کی جیلوں کے بارے میں رقم طراز ہیں:

”ہمارے جیل خانوں کو ”جامعہ جرائم“ کہنا بے جا نہ ہو گا۔ یہاں جرم سے نفرت کرنا تو کوئی کیا سیکھے گا، انسان سے نفرت کرنا سکھایا جاتا ہے۔ یہ جرائم کے ایسے ”دارالعلوم“ ہیں جہاں کے سند یافتہ ماہرین اپنے ”فن“ میں یکتائے روزگار ہوتے ہیں۔ مفلس اور بے آسرا، یہاں سے چور اور ڈاکو بن کر نکلتے ہیں۔“(۴)

راجہ انور کی اسیری کی داستان کو زندانی ادب کا ”گلہائے رنگ رنگ“ قرار دیا جا سکتا ہے انہوں نے روایتی اسیروں کی طرح روز و شب کے معمولات، نمبر داروں، مقدم حضرات اور جیلر کے انتظامی جذبات کا تذکرہ کرنے کی بجائے جیل کی دنیا کو ایک نئے انداز سے دیکھا ہے۔ زنداں میں انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں قیدیوں کے انٹرویو کیے اور ان سے جرائم کی کہانیاں اور اسباب و عوامل سن کر اپنی کتاب میں جمع کر دیئے تاکہ قارئین بھی جان سکیں کہ کس طرح ”جو نما گندم فروش“ معاشرے میں جرائم کے فروغ کا باعث بنتے ہیں۔ ایسے ہی ایک جیب کترے ”بجلی“ کی کہانی ہے جو ایک شفیق بزرگ کی مدد سے جرائم کی دنیا میں آیا اور اپنے فن کا ماہر تھا۔ پاکستانی جیلوں میں تو مقامی قیدیوں کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا ایسے میں اگر کوئی لاوارث غیر ملکی ان کا نشانہ بن جائے تو اس کا کیا حال ہو گا ایسے ہی ایک یوروپی (جرمن) قیدی سے(۵) راجہ انور کی ملاقات ہوئی جس سے جیل میں بے انتہا مشقت کروائی جا رہی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ صاحب موسیقار

ہیں۔ پوری دنیا میں پرفارم کر چکے ہیں اور راولپنڈی میں انھیں رات کو گھومتے ہوئے آوارہ گردی کے الزام میں گرفتار کر کے جیل پہنچا دیا۔ راجہ انور ایک خاص مقصد کے لیے جیل میں گئے تھے اور وہ مقصد تھا کہ پاکستانی عوام کی بھلائی کے لیے کچھ کیا جاسکے۔ وہ دورانِ تحریر اپنے مقصد کو فراموش نہیں کرتے۔ ان کی نظر مقامی سیاست کے ساتھ ساتھ عالمی امور پر بھی ہے۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے اور ان کے علم میں ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کو رائج کرنے کے لیے استعماری ممالک کیا ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں۔ ان کو علم ہے کہ یوروپ کا استعماری طبقہ بھی اپنی نئی نسل سے بیزار ہے کیونکہ مغرب کا نوجوان بھی اب بصیرت افروز ہے اوراستعماری ہتھکنڈوں کو آزمانے کے لیے آمادہ و تیار نہیں ہے۔ مغرب کی نژادِ نو کے بارے میں راجہ انور یوں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں:

> ''یہ نئی نسل انسانیت کا خون چوسنے کے لیے تیار نظر نہیں آتی اور یہی بات مغرب کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ آج کے یورپ آقا کو اپنے ظالمانہ سماج کی بظاہر بلند و بالا اور مضبوط عمارت میں وسیع شگاف نظر آ رہے ہیں۔ جو ایک نسل کے بعد دھڑام سے نیچے گرنے کو ہے۔''[۶]

جیل خانوں میں جنسی استحصال بھی ایک دردناک موضوع ہے۔ آغا عبدالکریم شورش کاشمیری سے لے کر راجہ انور تک تقریباً سبھی نثر نگاروں نے اس پر قلم اُٹھایا ہے۔ ''بڑی جیل سے چھوٹی جیل تک'' کے کئی صفحات میں ضمناً اور اجمالاً اس موضوع پر راجہ انور نے بڑے خوبصورت انداز میں قلم اُٹھایا ہے۔ راجہ انور ایک منجھے ہوئے خاکہ نگار دکھائی دیتے ہیں۔ جیل میں ان کی ملاقات ''اچھا شو کروالا''[۷] سے ہوئی۔ یہ نواب آف کالاباغ کا خاص آدمی تھا اور نواب کے قتل کے بعد انتقام کا نشانہ بنا۔ مصنف نے اس کا خوبصورت مختصر خاکہ تحریر کیا ہے۔ مشہور اداکار ''ندیم'' جب پانچ سال کے تھے تو راجہ انور نے انہیں جیل میں دیکھا ''پانچ سالہ قیدی'' کے عنوان[۸] سے راجہ انور نے بڑے دلچسپ انداز میں ساری معلومات بہم پہنچائی ہیں کہ کس طرح ننھا ''ندیم'' زنداں میں پہنچا۔ ''ندیم'' کے ہوتے ہوئے زنداں کے ماحول میں بڑی تبدیلی آئی۔

> ''بچے کی وجہ سے ہمارے احاطے کا ماحول گھر کا سا لگتا تھا۔ اس کی پیاری پیاری باتیں اس جہنم میں نعمتِ خداوندی سے کم نہ تھیں۔ اپنے گھروں اور بال بچوں سے بچھڑے ہوئے پیشہ ور قاتل، ڈاکو، چور اور مجرم جب کبھی، اس بچے کو دیکھتے، ان کے اندر کا سویا ہوا انسان جاگ اُٹھتا۔''[۹]

جری اور بہادر راجہ انور نے بڑی بے باکی کے ساتھ اپنی زندانی تالیف میں بڑے تلخ حقائق کو رواں انداز میں بیان کر دیا ہے۔ ایوبی دور کے بارے میں ان کا انداز اور لہجہ تیکھا ہو جاتا ہے:

> ”حضرت ایوب کا بھی کیا زمانہ تھا۔ جس نے جبینِ نیاز، آستانِ یار پر خم کی، پیا کی ایک نظر التفات سے اس کی زندگی بدل گئی راتوں رات تہی دست لکھ پتی بن گئے، بلکہ کروڑ پتی بن گئے، بدعنوانی، چور بازاری، رشوت ستانی اور دنیا بھر کی برائیاں ان کے دورِ پرنور میں اپنی انتہا کو پہنچیں۔“(۱۰)

”بڑی جیل سے چھوٹی جیل تک“ اپنی نوعیت کی منفرد زندانی نثری تصنیف ہے جس میں مصنف نے بہت سے پردے چاک کیے اور کئی تلخ حقائق سے پردہ اُٹھایا۔ راجہ انور کی شخصیت کسی زندہ کردار کی طرح کتاب کی ہر سطر میں جلوہ گر دکھائی دیتی ہے۔

قبر کی آغوش میں

”افغانستان کی جیل پلی چرخی میں بیٹے لمحات کی دردانگیز روداد۔“ ”موت کے منہ سے واپسی“(۱۱) کے عنوان سے شائع ہونے والی داستانِ اسیری میں راجہ انور نے افغانستان کی بدنامِ زمانہ جیل ”پلِ چرخی“ میں اپنے ایامِ اسارت کا بیان ہی تحریر نہیں کیا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب ”قبر کی آغوش میں“ جنرل ضیاء کے مارشلائی دور، بھٹو کی پھانسی، معاصر سیاسی حالات اور مارشل لاء کے ردِ عمل کے سلسلہ میں پیش آمدہ واقعات کے حوالہ سے تاریخی دستاویز قرار دی جا سکتی ہے۔ اگر سیاسیات یا بشریات کے طالب علم کو پاکستان کے تین عشروں ۱۹۷۰، ۸۰ء اور ۹۰ کی دہائیوں کے سیاسی و سماجی حالات کا بے لاگ اور حقیقی تجزیہ مطلوب ہو تو یہ کتاب اس باب میں ایک آئینہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کے اختتام کے بعد راجہ انور بھی ان لوگوں میں شامل تھے جو پاکستان سے فرار ہو کر افغانستان میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ افغانستان میں بھٹو کے صاحبزادے میر مرتضیٰ بھی مقیم تھے اور ایک تنظیم ”الذوالفقار“ کے ذریعے مزاحمتی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ راجہ انور ان حالات میں مرتضیٰ بھٹو کے ساتھ رہے۔ ان ایام کی پوری تفصیلات راجہ انور نے اپنی کتاب ”دہشت گرد شہزادہ“ میں بہم پہنچائی ہیں۔(۱۲) یہ کتاب ”دہشت گرد شہزادہ“ بھی ایک تاریخی دستاویز ہے۔ ۱۹۸۰ء میں راجہ انور کے مرتضیٰ بھٹو سے اختلافات ہو گئے۔ راجہ انور پاکستان واپس آ کر ضیاء مارشل لاء کے خلاف مزاحمت کرنا چاہتے تھے لیکن مرتضیٰ

بھٹو اس کے لیے تیار نہ ہوئے۔ انہوں نے افغان حکومت کی مدد سے راجہ انور کو پلِ چرخی جیل میں قید کروا دیا اور ۱۹۸۱ء کے طیارہ اغوا کیس کے بعد مرتضیٰ نے اعلان کیا تھا کہ (۱۳) راجہ انور کو گولی مار دی گئی ہے۔

راجہ انور کی تدفین کے لیے مرتضیٰ بھٹو نے کابل میں ایک قبر بھی کھدوائی تھی لیکن مرتضیٰ کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ راجہ انور نے ”پلِ چرخی“ جیل سے رہائی کے بعد خود یہ قبر اپنی آنکھوں سے دیکھی۔(۱۴) ”قبر کی آغوش میں“ کا مطالعہ کرتے ہوئے واقعات اور حقائق کی ایک نئی دنیا قاری پر وا ہوتی ہے۔ افغانستان کو گزشتہ کئی برسوں سے امن نصیب نہیں ہوا لیکن ”کامریڈوں“ کے بارہ سالہ اقتدار کا جائزہ لیتے ہوئے افغانستان کے کامریڈ حکمرانوں کے بارے میں راجہ انور تحریر کرتے ہیں:

> ”کامریڈوں کے بارہ سالہ دورِ اقتدار میں ایک بھی ایسا واقعہ نہیں سنا کہ ان میں سے کسی نے سرکاری اِملاک یا عوام کی زمینوں پر قبضہ کیا ہو یا اپنے اور اپنے اہل خانہ کے لیے عالی شان مکانات تعمیر کیے ہوں۔ نہ کسی نے ملک کے اندر مال اکٹھا کیا اور نہ ملک سے باہر بنک بیلنس کھولے۔ نور محمد ترکئی تقریباً ڈیڑھ سال تک افغانستان کا صدر رہا۔ ستمبر ۱۹۷۹ء میں جب اسے قتل کیا جانے لگا تو اس نے بازو پر بندھی سرکاری گھڑی واپس کرتے ہوئے کہا کہ یہ ملک کے نئے صدر حفیظ اللہ امین کو دی جائے۔ قصرِ صدارت میں اس کا کل اثاثہ چالیس ہزار افغانی یا ساڑھے پانچ ہزار روپے نقد اور ایک عدد لوہے کا ٹرنک تھا۔“(۱۵)

مختصر اور جامع الفاظ میں راجہ انور نے میر مرتضیٰ بھٹو کی شخصیت کا جائزہ لیا ہے جو اس کی مزاحمتی تحریک کا اصل چہرہ عوام کے سامنے لاتا ہے۔ راجہ انور اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

> ”نوجوان اور پرجوش مرتضیٰ بھٹو اپنے اس جذباتی تجزیے کو تاریخ کا حرفِ آخر سمجھتا تھا لہٰذا اس نے پارٹی کے بہت سے کارکنوں کو بے رحمانہ انداز میں جنرل ضیاء کے ہتھے چڑھا دیا اور فوجی عدالتوں نے ان غریب کارکنوں کی کھال اُدھیڑ کر رکھ دی۔“(۱۶)

دسمبر ۱۹۷۹ء میں جب روس نے افغانستان پر حملہ کیا تو راجہ انور بھی کابل میں مرتضیٰ بھٹو اور دوسرے لوگوں کے ساتھ موجود تھا اپنی کتاب میں راجہ انور نے اس حملے کے چند واقعات، افغان روس جنگ اور پھر ۱۹۹۲ء کے بعد کے سیاسی و سماجی حالات کو موثر اور وقیع انداز میں بیان کیا

ہے۔ یہ سر دست ہمارا موضوع نہیں لیکن ان حالات کے تناظر میں راجہ انور کی تحریر ان کی سیاسی بصیرت کی شاہد ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

> "یہ تاریخ کا جبر ہے کہ خون کے دریا سے گزرے بغیر نہ تو سماج کو بدلنا ممکن ہے اور نہ حکمران طبقات کے اقتدار کو۔ ماوزے تنگ نے کتنا درست کہا تھا کہ انقلاب نہ رقص ہے نہ کشیدہ کاری بلکہ یہ ایک انتہائی خون آشام عمل کا نام ہے۔"(۱۷)

"قبر کی آغوش میں" میں تحریر تفصیلات کافی روح فرسا اور جھنجھوڑ دینے والی ہیں۔ ایک پیراگراف کا حوالہ دے کر ہم اپنی بحث سمیٹتے ہیں کہ اُردو ادب میں زندانی آپ بیتیوں کے ذیل میں سید حسین احمد مدنی کی "اسیر مالٹا" سے "قبر کی آغوش میں" کی اشاعت نے اُردو نثر کے وقار میں اضافہ کیا۔ مصنف نے عالمی اور بین الاقوامی سیاسی اور سماجی منظر پر پر مغز تبصرہ کیا ہے۔ قید کے دوران مصنف کی ذہنی، نفسیاتی اور روحانی کیفیات کے اظہاریے یوں تو اس کتاب کا خاصا ہیں لیکن والدہ کی وفات کی اطلاع پر مصنف کے ضبط کے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں کیونکہ مصنف کی والدہ کی موت کا سبب، وہ خبر بنی کہ راجہ انور کو پل چرخی جیل میں پھانسی دے دی گئی ہے۔ یہ خبر مرتضیٰ بھٹو نے مشہور کی تھی۔ والدہ کی وفات پر مصنف کے تاثرات پیش کر کے ہم اس بحث کو سمیٹتے ہیں۔ یہ بیان نہیں بلکہ ایک آفاقی اور تلخ سچ ہے:

> "ذرا المیہ دیکھیے کہ میں بھٹو کی زندگی بچانے کے لیے اپنا سر ہتھیلی پر رکھے گلی گلی اور کوچہ کوچہ دھکے کھاتا پھرا لیکن مجھے اپنی سیاسی وفاداریوں کے صلے میں پہلی قسط اپنی ماں کے قتل کی شکل میں وصول ہوئی۔ مرتضیٰ نے دوسری قسط کی ادائیگی کے لیے میری قبر کھدوا رکھی تھی۔ واقعی سیاسی دوستیاں بھی بے معانی ہوتی ہیں اور بڑے خاندانوں سے وفاداریاں بھی۔"(۱۸)

حوالہ جات

۱۔ wikipedia.org/wiki-Raja-anwar

۲۔ راجہ انور، بڑی جیل سے چھوٹی جیل تک، لاہور: کلاسیک، فروری ۲۰۰۷ء، ص:۱۵

۳۔ راجہ انور، بڑی جیل سے چھوٹی جیل تک، لاہور: کلاسیک، ۲۰۰۱ء، ص:۵۹

۴۔ ایضاً، ص:۱۲۰

۵۔ ایضاً، ص:۷۶

۶۔ ایضاً، ص:۷۸

۷۔ ایضاً، ص:۱۲۶

۸۔ ایضاً، ص:۱۲۵

۹۔ ایضاً، ص:۱۲۶

۱۰۔ ایضاً، ص:۹۰

۱۱۔ راجہ انور، قبر کی آغوش میں، لاہور: جہانگیر بکس، ۲۰۱۰ء، ص:۱

۱۲۔ راجہ انور، دہشت گرد شہزادہ، لاہو، کلاسیک، ۲۰۰۷ء، ص:۳

۱۳۔ ایضاً، ص:۵

۱۴۔ راجہ انور، قبر کی آغوش میں، ص:۶

۱۵۔ ایضاً، ص:۴

۱۶۔ ایضاً، ص:۲

۱۷۔ ایضاً، ص:۱۶۸

۱۸۔ ایضاً، ص:۶۸